# تہذیبی روایات کا مکالمہ

انیس احمد

۱۹۷۹ء میں ایران کا اسلامی انقلاب کئی پہلوؤں سے امت مسلمہ اور خصوصاً اسلام کی تحریکی فکر رکھنے والے افراد کے لیے نفاذ اسلام کی ایک نوید بن کر ابھرا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے علاماتی (symbolic) خلافت عثمانیہ کے زوال سے جو دور شروع ہوا، اس میں امت مسلمہ اپنے مستقبل اور اختیار و قوت کے دوبارہ حصول کے لیے مسلسل سرگرداں رہی۔ چالیس کی دہائی سے مسلم ممالک میں سیاسی آزادی کا دور شروع ہوا اور یہ امید بندھی کہ پاکستان، انڈونیشیا، مشرق وسطیٰ کے بہت سے ممالک، سیاسی آزادی کے ساتھ ثقافتی اور نظریاتی آزادی بھی حاصل کرلیں گے، لیکن یہ امیدیں بڑی حد تک ناتمام رہیں۔ اس پس منظر میں ایرانی انقلاب اسلامی قوتوں کے لیے غیر معمولی طور پر اپنی جدوجہد پر اعتماد میں اضافہ کا باعث بنا۔ تحریکات اسلامی کے قائدین نے نہ صرف ذاتی بلکہ اجتماعی طور پر ایران میں طاغوتی ملوکیت کے خاتمہ اور اسلامی نظام کے قیام کے عزم کو خوش آمدید کہتے ہوئے نمائندہ افراد کے وفد کی شکل میں تہران جا کر امام خمینی کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ یورپ اور امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی گزار رہے ہیں، اسلامی انقلاب کی کھل کر حمایت کی۔

یہ انقلاب ان قوتوں کے لیے سخت تشویش کا باعث بنا جو ایران کو اپنی بین الاقوامی سیاست کا سب سے زیادہ مستحکم ستون سمجھتے تھے۔ فرانس کو چھوڑتے ہوئے یورپ و امریکہ کے بیشتر ممالک نے اسے لادینی جمہوریت، اباحیت اور مغرب زدگی کے لیے ایک ''بنیاد پرست'' خطرہ قرار دیتے ہوئے پورے خطے کے لیے ایک نئی حکمت عملی وضع کرنی شروع کی۔ اسی دوران ایرانی طلبہ کی جانب سے (پاسدارانِ انقلاب کے تعاون سے) امریکی سفارت خانے کے عملے کو یرغمال بنانے کے واقعہ نے ایران کے خلاف امریکی جذبات کو مشتعل کرنے اور ایران میں امریکہ کے خلاف نفرت اور غصہ کو بھڑکانے میں جلتی پر تیل کا

کام کیا۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ بعض قوتوں کے لیے ایک منطقی ضرورت ہو لیکن اس ایک واقعہ کے اثرات معاشی، سیاسی اور جذباتی سطح پر ایران کے حوالے سے پورے عالم اسلام پر پڑے۔ اس مفروضہ کو حقیقت مانتے ہوئے کہ اسلام اور مغربی سامراجی طاقتوں کے درمیان کوئی مکالمہ، تبادلہ خیال، اظہار قوت کے علاوہ نہیں ہوسکتا، نہ صرف ایران بلکہ دیگر مسلم ممالک کے خلاف بھی معاشی اور سیاسی پابندیوں کا حربہ استعمال کیا گیا۔

اس حکمت عملی کا ردعمل واضح تھا۔ چنانچہ ہر دو جانب سے زبانی جنگ اور موقع ملنے پر ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوششیں ہوتی رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس دوران میں نہ صرف مغربی سامراج بلکہ خود ایران میں زمینی حقائق کے پیش نظر ایک نئی حکمت عملی وضع کرنے پر بھی غور ہوتا رہا۔ داخلی حالات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ یہ عمل سرعت سے ہو، لیکن نئی صدی کے آغاز پر صدر خاتمی کی ایرانی قیادت نے غیر معمولی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹے اور بڑے ''شیاطین'' کے ساتھ بھی مکالمہ کو ممکن قرار دیتے ہوئے اس عمل کے آغاز کی طرف پیش قدمی کا اعلان کیا۔

مغربی سامراج اور اہلِ فکر نے بھی اس دوران اپنے موقف پر واضح نظر ثانی کی کوشش کی۔ چنانچہ ایران کی قیادت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ ماضی کی تلخ یادوں کو دفن کیا جائے اور اگر ایران نئی صدی میں کوئی تعمیری کردار ادا کرنا چاہتا ہے تو عالمگیریت (globalization) کی حقیقت کو مانتے ہوئے اپنے رویہ میں تبدیلی کرے، نعروں کی نفسیات سے اپنے آپ کو آزاد کرے، اپنے تیل کے ذخائر پر بے جا اعتماد و فخر پر نظر ثانی کرے، اپنے عوام کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مغرب کے ساتھ تجارتی تعاون پر غور کرے اور خاص طور پر خود پیدا کردہ اندرونی معاشی اضمحلال کو کسی بیرونی ''شیطان'' کے سر منڈھنے کی کوشش ترک کرے۔ مغربی پالیسی سازوں کا کہنا یہ ہے کہ تیل فروخت کرنے والی اقوام کو تیل خریدنے والی اقوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا اور [نام نہاد] جدید معاشی نظام (N.E.O) میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنائے بغیر بعض بنیادی سمجھوتے (adjustment) کرنے ہوں گے۔

ابھی حال ہی میں ایران کی وزارتِ خارجہ کے زیر اہتمام تہران میں منعقدہ ایک بین الاقوامی

کانفرنس میں شرکت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ایران کے پالیسی ساز تحمل اور صبر کے ساتھ مغربی مفکرین کے ان خیالات کو سننے کے بعد ایک نسبتاً زیادہ عملی (pragmatic) حکمت عملی وضع کرنے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔ اسلامی فقہ کا ایک مستقل مضمون سیاست شرعیہ ہے جس کا مقصد بھی یہ ہے کہ بدلتے حالات میں شریعت کے ابدی، کلی اور جامع اصولوں کی مدد سے کس طرح ایک نئی صورت حال کا حل تلاش کیا جائے۔ مصلحت عامہ کا اصول بھی (جسے مصالح مرسلہ بھی کہا جاتا ہے) وسیع تر حکمت کے پیش نظر، شریعت کی بالادستی قائم رکھتے ہوئے، ایک صورت حال کا حل تلاش کرنے میں مدد کرتا ہے۔

بہ ایں ہمہ اس طرح کی صورت حال میں چند بنیادی سوالات زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اولاً ایک نظریاتی انقلاب کی مدعی جماعت کے لیے اصل اہمیت طویل المیعاد ہدف وحکمت عملی کی ہے یا قلیل المیعاد اور فوری حصول منفعت کی؟ اور کسی فوری اور قلیل المیعاد مقصد کے حصول کے لیے کس حد تک اصل ہدف کو وقتی طور پر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ ثانیاً عملیت پسندی (pragmatism) کی سرحدیں کہاں تک ہیں؟ ایک حدیث نبویؐ میں جہاں حلال اور حرام کے بیّن ہونے کے ساتھ ساتھ مشابہات سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے، اس کی روشنی میں ''اضطرار'' اور ''ضرورت'' کی حدود کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟ ثالثاً مادی طور پر ایک مستحکم فریق کے ساتھ مادی طور پر ایک غیر مستحکم فریق کے مکالمہ اور احترام مفادات کی شکل کیا ہوگی؟

یہ امر بھی غور وفکر کا متقاضی ہے کہ عالمگیریت (globalization) اور یک قطبی (unipolar) قوت ہونے کی دعوے دار ریاست کے ساتھ معاشی تعلقات کا تانا بانا کیا صرف معیشت کے میدان تک محدود رہے گا یا غالب معاشی قوت کی ثقافت اس کی اقدار حیات، اس کا طرز زندگی اور مقصد حیات، محسوس اور غیر محسوس اثرات بھی معاشی سرگرمی اور تعلقات کے ہمراہ سرحدیں پار کر کے کم ترقی یافتہ ممالک پر اثر انداز ہوں گے؟ حقیقت واقعی یوں ہے کہ ابلاغ عامہ کے انقلاب نے جغرافیائی سرحدوں کو اضافی بنا دیا ہے اور ثقافتی اثرات، ایسے مقامات پر بھی جن کے نظریاتی ثقل کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے، دیکھنے میں آرہے ہیں۔ ایک معمولی مشاہدہ جو میں نے خود کانفرنس کے دوران کیا تھا کہ بعض ایرانی خواتین روایتی ''مانتو'' (سیاہ چادر) تو لازماً استعمال کر رہی تھیں، جس سے وہ تمام شرعی تقاضے پورے ہو رہے تھے، جو

ایک مسلمان خاتون کی پہچان کہے جاسکتے ہیں، لیکن گزشتہ دس سال کے عرصہ میں اس چادر کی پیائش میں قابل محسوس فرق واقع ہوا ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد یہ ٹخنوں بلکہ پاؤں تک تھی جب کہ آج یہ نصف پنڈلی پر آ گئی ہے جس کی بنا پر jeans جو پہلے مکمل طور پر چھپ جاتی تھی، غیر ثقافت کے اثرات کی چغلی کرتی نظر آتی ہے۔ (یہاں یہ بات واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ شریعت نے حجاب کے دائرہ میں جینز پہننے کی ممانعت نہ پہلے کی تھی نہ اب کرتی ہے، یہاں صرف اس پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ شدت جو بہرصورت دین کا جزد پہلے بھی نہ تھی اب وسعت میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے اور اس بنا پر ان طبقات کی پریشانی، جو دین کو غلو اور شدت ہی کے تناظر میں درست سمجھتے ہیں، کسی تعارف کی محتاج نہیں۔)

ایرانی طرز عمل اور طرز فکر میں محسوس یا غیر محسوس طور پر سامنے آنے والی اس تبدیلی کے مثبت اور منفی اثرات نہ صرف ایران بلکہ ان تمام افراد پر پڑیں گے جو ایران کے انقلاب کو ایک شیعی انقلاب کے تصور سے بلند ہو کر عالمی تناظر میں اسلام اور طاغوت کی کشمکش کا مظہر سمجھتے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ قدامت پسند لیکن بااختیار حلقوں میں ایسی کسی تبدیلی کی مضبوط مخالفت بھی موجود ہے۔ خود تحریکات اسلامی کے لیے بھی یہ صورت حال لمحہ فکریہ فراہم کرے گی کہ نظریہ سے مکمل وفاداری اور اصولیت کے باوجود وہ کون سے دائرے ہیں جہاں ''عملیت'' اختیار کرنی ہوگی اور کس طرح ایک ایسی حکمت عملی وضع کی جائے گی جو تحریکات اسلامی کی نظریاتی اساس اور امتیاز کو تحلیل کیے بغیر ان کے دوررس اہداف کے حصول میں مددگار ہو سکے۔

اسلام کا مزاج اصلاً دعوتی اور اصلاحی ہے اس لیے مکالمہ اس کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کے سخت ترین دشمن سے بھی مکالمہ کے ذریعہ تعلق پیدا کرنا فرائض دعوت میں شامل ہے۔ اس کی واضح مثال اللہ تعالیٰ کا اپنے سچے رسول حضرت موسیٰ علیہ اسلام سے یہ کہنا ہے کہ جاؤ اور فرعون کو دعوت اسلام دو، وہ حد سے گزر گیا ہے، اور یہ بات بھی واضح فرما دی تھی کہ اس مکالمہ کا مزاج اور انداز متشدد نہ ہو بلکہ ''قولِ لیّن'' انتہائی مناسب اور نرم انداز گفتگو اختیار کیا جائے تا کہ وہ ہدایت کی طرف آ سکے۔ گویا شرک اور طاغوت سے نفرت تو کی جائے گی لیکن مشرک اور طاغی کو مسلسل مکالمہ کے ذریعہ حق کی دعوت دی جاتی رہے گی، یہاں نفرت شرک سے ہے مشرک سے نہیں۔

مغرب سے جس مکالمہ کی طرف صدر خاتمی نے اپنی متعدد گفتگوؤں میں اشارہ کیا ہے، ہمیں اس کی اخلاقیات کے تعین کے لیے بھرپور طور پر، قرآن و حدیث سے مدد لینی ہوگی اور واضح اصول اور نظریاتی بنیادوں پر اس کے خدوخال کا تعین کرنا ہوگا۔ اسلام کا دعوتی مزاج مطالبہ کرتا ہے کہ اسلامی فکر و عقیدہ، ثقافت اور معاشرت کی ترویج و تحفظ پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کیا جائے، ہاں فکر و عقیدہ کی مکمل آزادی کے ساتھ دیگر اقوام اور تہذیبوں کے ساتھ پُر اعتماد طور پر مکالمہ و تبادلہ خیالات اسلامی دعوت کے منشور کا لازمی جزو ہے۔ چنانچہ اہل کتاب کے حوالہ سے قرآنی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ آؤ اے اہل کتاب ہم کیوں نہ ایک مشترک بنیاد سے اس مکالمہ کا آغاز کریں اور دیکھیں کہ کن معاملات میں تعاون ہو سکتا ہے اور کن معاملات میں اختلاف کے باوجود ایک احترام کا تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس مکالمہ کو نظری سطح سے آگے بڑھاتے ہوئے معاشرتی سطح پر قیامت تک کے لیے عملاً قائم کر دیا گیا اور نہ صرف اہل کتاب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کو، جو مکالمہ اور تبادلہ خیالات کا ایک موثر ذریعہ ہے، جائز قرار دیا گیا بلکہ ان کے ساتھ معاشرتی تعلق، جس میں سب سے زیادہ قریبی تعلق شوہر اور بیوی میں ہو سکتا ہے، ممکن قرار دیا گیا۔ چنانچہ مسلمان مرد کو کسی اہل کتاب خاتون سے نکاح کی اجازت اس جانب ایک مثبت اور عملی اقدام کی حیثیت رکھتی ہے۔ یاد رہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اور عقیدہ کے تحفظ کے لیے ایک مومنہ کے کسی اہل کتاب مرد سے نکاح کی ممانعت بھی کر دی گئی ہے۔

ہمیں اپنے تجزیہ میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ میں اس مکالمے کے لیے کون سے اصول طے فرمائے تھے۔ بالخصوص انسانی حقوق اور معاملات کے حوالے سے میثاق مدینہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں انسانی جان اور عزت کا احترام ایک قدر مشترک ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ بین الانسانی مساوات کے اصول کی بھی پیروی کی جائے گی۔ قرآن کریم نے یہ بات بھی متعین کر دی ہے کہ مقامات عبادت خواہ وہ مسجد ہو، کلیسا ہو یا سینا گاگ اور ٹمپل، امت مسلمہ ان کے تحفظ اور آزادی کے لیے ہمیشہ اپنے وسائل کا استعمال کرے گی۔ اس عمومی پس منظر میں دوسری جانب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ عالمگیریت (globalization) کے نام پر کس طرح مغربی سامراجی طاقتیں اپنی پسند کی معیشت، معاشرت اور ثقافت کو تمام انسانوں کے لیے معیار قرار دیتے ہوئے دوسروں پر مسلط

کرنا چاہتی ہیں۔

مزید یہ کہ بادی النظر میں عالمگیریت کے نام پر جو تہذیب وثقافت اور معاشرت دیگر ممالک پر برضاورغبت یا بالجبر مسلط کی جارہی ہے، کیا یہ انسانی حقوق پر ایک حملہ نہیں ہے؟ ایک بامعنی ثقافتی مکالمے کے آغاز سے پہلے ہمیں اس ثقافتی یلغار کی گرفت اوراس کے وسیع اثرات ومضمرات کا اندازہ کرنا ہوگا۔ یہ اور دیگر متعلقہ پہلو ہمیں مزید غوروفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

نوٹ: حالیہ شمارے میں سابقہ سوویتی اتحاد کے حوالے سے ہم ایک مفصل مضمون اپنی روایت سے ہٹ کر پیش کررہے ہیں۔ مضمون اپنی معلومات کے لحاظ سے اہم ہے اس لیے مختصر کرنے یا دو اقساط میں دینے کے بجائے اسے یکمشت ہی شائع کیا جارہا ہے۔ اس بنا پر دیگر موضوعات پر بعض اہم مضامین اس شمارے میں نہ آسکے جو انشاءاللہ آئندہ پیش کیے جائیں گے۔ (مدیر)